ڈاکٹر محمد تنویر
Dr. Mohd Tanveer, DDA, Mahipalpur Road Vasant Kunj, Delhi

ترقی پسند تحریک کا نمائندہ شاعر: مخدوم محی الدین

بیسویں صدی اردو زبان وادب کے لیے بہت خاص رہی ہے۔اس زمانے میں شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں حسن وعشق،لب ورخسار اور محبوب کے خدوخال کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں آزادی کے جذبے کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے۔کسی نے ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے لگائے تو کسی نے ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' کے گیت گائے جس نے انگریزوں کے ظلم وستم کو نہ صرف برداشت کرنے کی ہمت پیدا کی بلکہ ان سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی عطا کیا۔کیونکہ یہ زمانہ ہندوستانی باشندوں کے لیے بہت ہی کش مکش اور دشواریوں سے بھرا ہوا تھا۔ہر قدم پر ایک نئے امتحان سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔اس لیے کہ اب انگریزوں کا ظلم وستم ان کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا دوسرے اب وہ اپنے ہی ملک میں غلاموں کی سی زندگی بسر کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔وہ کسی بھی صورت میں انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔ آزادی کا جذبہ سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔یہی وہ زمانہ تھا جس میں آزادی کی تحریک کی باگ ڈور ایک طرح سے جوشیلے نوجوانوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی اور آزادی کے یہ متوالے کسی بھی صورت میں ہندوستان کی مقدس سرزمین کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر دینا چاہ رہے تھے اس کے لیے وہ کسی بھی طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قربانی کے بغیر آزادی کا تصور بے معنی ہے۔آخر کار ان کی قربانی رنگ لائی اور آزادی کا وہ خوبصورت ترین دن بھی آ گیا جس کا خواب ان کی آنکھیں برسوں سے دیکھ رہی تھیں اور جس آزادی کے لیے ان کا دل تڑپ رہا تھا۔

آزادی سے پہلے ملک کا جو حال تھا اس میں ناانصافی اور ظلم وستم کی جو داستان انگریزوں

کی طرف سے لکھی جا رہی تھی اس کے خلاف ہمارے اردو کے شاعروں نے سب سے پہلے آواز اٹھائی حالانکہ ان کی آواز کو انگریزوں نے طاقت کے ذریعے دبانے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ پوری طرح ناکام ثابت ہوئے۔اس دور کے شاعروں میں فیض احمد فیض، اسرارالحق مجاز، ساحر لدھیانوی اور علی سردار جعفری کے ساتھ ساتھ مخدوم محی الدین کا نام سرفہرست لیا جا سکتا ہے۔

مخدوم محی الدین کا نام اردو شاعری کے حوالے سے بہت ہی اہم ہے۔ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کی وابستگی ترقی پسند تحریک سے اس قدر تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے سے لگتے ہیں۔شاذ تمکنت لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک بالخصوص ترقی پسند شاعری کو جن چند شعراء نے بصارت وبصیرت کے ساتھ طبل وطنطنہ رعد ورجز اور ترانہ وترنم سے گرمایا ان میں مخدوم محی الدین کا نام ایک آتشیں مینارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۱)

مخدوم محی الدین ۴ فروری ۱۹۰۸ میں اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ان کا پورا نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خدری تھا۔مخدوم ایک مذہبی گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے کہ لوگ ان کے گھرانے کو بہت ہی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔احترام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوسعید خدریؓ سے جا ملتا ہے۔

مخدوم نے ابھی ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ نے دوسری شادی کر لی اور شہر حیدرآباد میں اپنا گھر بسا لیا۔مخدوم کو والدہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تو مخدوم کو یقین ہو گیا کہ ان کے والدین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اپنی ماں کے بارے میں مخدوم کو اس وقت پتہ چلا جب وہ ابتدائی تعلیم حاصل کر کے حیدرآباد کالج میں داخل ہوئے۔والدہ سے مل کر مخدوم بہت خوش ہوئے۔پھر وہ انھیں کے ساتھ رہنے لگے۔

والدین کے انتقال کے بعد پرورش وپرداخت کی ذمے داری چچا مولوی بشیرالدین کے حصے میں آئی۔مخدوم کی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں ان کے چچا نے کافی محنت کی۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا کہ مخدوم کا گھرانہ مذہبی تھا۔اس لیے خاندان کے لوگ مذہب کے معاملے میں ذرا بھی لاپرواہی برداشت نہیں کرتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ مخدوم خود نمازی تھے اور پنج

وقتہ نماز با جماعت ادا کرتے تھے۔مسجد کی بہت ساری ذمہ داریاں انھیں کے سپرد تھیں۔مخدوم کا خاندان مذہب کے ساتھ ساتھ ملک کے حالات میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔خود ان کے چچا ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے چلائی جارہی قومی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔مہاتما گاندھی سے بے حد متاثر تھے اور سادگی سے رہنا پسند کرتے تھے۔مخدوم کی شخصیت میں جو رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا غالباً چچا کی تربیت کا ہی اثر تھا۔مخدوم کے چچا ہمیشہ ان کو ساتھ لے کر کھانے کے دسترخوان پر بیٹھتے اور شعوری طور پر دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔عام طور سے گفتگو کا موضوع سیاسی ہی ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے ان کی دلچسپی بھی بڑھنے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخدوم بچپن ہی میں ملک کے حالات سے واقف ہو گیے۔اور ان کے دل میں بھی دھیرے دھیرے آزادی کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔دراصل دسترخوان پر خبریں فراہم کر کے ان کے چچا نے مخدوم میں عصری شعور پیدا کر دیا تھا اور یہ شعور دھیرے دھیرے پختہ ہوتا چلا گیا۔

مخدوم کی تعلیم ایک ہی جگہ پر مستقل طور پر نہیں ہو پائی۔اس لیے کہ ان کے چچا ملازمت پیشہ تھے اور ان کا تبادلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتا رہتا تھا۔لہٰذا مخدوم کو ہر جگہ ساتھ جانا پڑتا اور پھر مخدوم کو نئے سرے سے تعلیم کا سلسلہ جاری کرنا پڑتا۔مذہبی ہونے کی وجہ سے ان کے چچا مدرسے کی تعلیم کو بہتر مانتے تھے۔اسی لیے جہاں بھی گئے مخدوم کا داخلہ مدرسے میں ہی کراتے۔ میٹرک کے بعد چچا اور بھتیجے میں تعلیم کو لے کر تھوڑا اختلاف پیدا ہو گیا۔چچا چاہتے تھے کہ مخدوم مدرسے ہی میں تعلیم حاصل کریں لیکن مخدوم انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔آخر کار مخدوم اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں داخلہ لے لیا۔ساتھ ہی ساتھ دینی تعلیم کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔شاد تمکنت مخدوم کی کارگزاریوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جامعہ ان کے لیے تعلیم گاہ تو تھی ہی لیکن تفریح گاہ بھی تھی، شرارت، لطیفے، چٹکلے، چھیڑ چھاڑ سے انھیں اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ صف اول کے طالب علم کہلاتے۔''(۲)

مخدوم اپنی شاعری کا آغاز جامعہ عثمانیہ میں طالب علمی کے دوران ہی کیا۔ان کی ابتدائی شاعری کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''ہرفن کار کی طرح ابتدا میں مخدوم کو بھی اپنے عاشقانہ یا جذباتی اور ذہنی تجربات کو پیش کرنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ان کا ذوق اور علمی سرمایہ، جوانی کا محدود مشاہدہ اور شوق اظہار اس شاعری کے لیے کافی تھا۔ جس کے نمونے طور، ساگر کے کنارے، شگن ،لمحہ، رخصت، جوانی، سجدہ اور یاد ہے وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔''(۳)

مخدوم تعلیم کے ساتھ ساتھ کالج کی ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔شاعری کے علاوہ ڈرامہ لکھنے اور اس میں حصہ لینے کا شوق تھا۔مخدوم کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ سرخ سویرہ، گل تر، اور بساط رقص، سرخ سویرہ کی پہلی ہی نظم طور ایک رومانی نظم ہے اور آغاز محبت کی ایک خوبصورت داستان بھی۔نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے نازوانداز حیا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی
دلوں میں اژدہام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

ابتدائی زمانے میں مخدوم نے جو عشقیہ اور رومانی نظمیں لکھیں ان میں بھرپور تازگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے۔سجدہ، انتظار، محبت کی چھاؤں، نامہ حبیب، وہ، نورس اور پشیمانی وغیرہ نظمیں عشق اور رومان سے بھرپور ہیں۔مخدوم کے یہاں کہیں بھی ہوس پرستی اور لذتیت دکھائی نہیں دیتی۔ایسا لگتا ہے کہ مخدوم اور ان کے محبوب کے بیچ شیطان کا داخلہ نہیں ہو پاتا تھا۔اس لیے کہتے ہیں:

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

اس نظم کا عنوان طور ہے، طور سے مراد وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے نور کو دیکھا تھا اور عاشق کے دل کو قرار آیا تھا۔ مخدوم نے اسی تاریخی واقعہ کا سہارا لے کر عشق کی پاکیزگی کو اجاگر کیا ہے۔ نظم کے آخری بند کے دو مصرعے اس طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی

ملک میں سماجی ناانصافی، دولت کی غلط تقسیم، سرمایہ داروں کے مظالم، کسانوں کی بے چارگی، غریبوں کی بے بسی، فرقہ پرستی اور ہندوستان کی غلامی سے پیدا ہونے والی صورت حال نے مخدوم کے دل کو حد درجہ متاثر کیا اور وہ رومانیت پسند ہوتے ہوئے بھی انقلاب کی راہ پر چل نکلے۔ مخدوم ایسے شاعر ہیں جو اپنی نظموں سے انگریزوں کو للکارا نہیں بلکہ انقلابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا۔ جس کے باعث جیل کی چہار دیواری بھی ان کا مقدر بنی۔ مخدوم کے انقلابی ذہن نے ترقی پسند تحریک کو اپنے لیے موافق سمجھا اور اس میں شریک ہو گیا۔ پھر دھیرے دھیرے مخدوم کے کلام میں انقلاب اور بغاوت کا جذبہ بھی شامل ہونے لگا۔ لیکن رومان بھی اپنی جگہ قائم رہا۔ اسی لیے ان کی نظموں میں انقلاب اور رومان کی آواز بیک وقت سنائی دیتی ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

> ''وہ انقلاب کا انتظار بھی اسی طرح کرتا ہے جیسے کوئی کسی خوش جمال محبوب کا انتظار کرتا ہے۔ مخدوم کے مزاج میں غنائیت کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عملی زندگی میں انقلابی سپاہی ہوتے ہوئے اپنی نظموں کو واعظانہ انداز اور خشکی اور کرختگی سے بچا لیا۔'' (۴)

نظم انقلاب میں مخدوم کو اسی انقلابی جذبے کی عکاسی دکھائی دیتی ہے جو ان کے دل و دماغ میں چھایا ہوا تھا۔ ان کے نظم میں صرف انقلاب نہیں ہوتا تھا بلکہ بغاوت کا بھی عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس نظم میں مخدوم انقلاب کا انتظار ایسے کر رہے ہیں جیسے کوئی اس محبوب کا کرتا ہے جو خوبصورت کا پیکر ہو۔

اے جان نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
نہ تابنا کی رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب معموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم کی نظموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں براہ راست انداز تخاطب ہے چونکہ مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے ایک فعال رکن تھے اس لیے جو نظمیں وہ لکھتے اس کو عوامی جلسے میں پڑھتے تھے اسی لیے انھوں نے علامت یا ابہام سے کام نہیں لیا، مخدوم کی نظموں میں نوابوں، راجاؤں، زمینداروں اور سود خور مہاجنوں کے جبر و استحصال کی کہانی بھی ملتی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ذاتی غم اور کرب پر مظلوم عوام کے درد و کرب کو ترجیح دی ہے۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔ شاذ تمکنت، مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے، ص ۱۳
۲۔ شاذ تمکنت، مخدوم، حیات اور کارنامے، ص ۱۹
۳۔ فاروق ارگلی (مرتب) کلیات مخدوم، ص ۸۴
۴۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص ۶۲۔۱۶۱